# لغات واعرابِ قرآن (۱۰)

پروفیسر حافظ احمد یار

## سورۃ البقرہ (۵)

(ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کی وضاحت مقدمہ (حکمت قرآن فروری ۸۹ء) میں کر دی گئی تھی۔ جن حضرات کی نظر سے وہ شمار نہیں گزرا۔ ان کے لیے دوبارہ اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ [قطعہ بندی کے لیے سب سے پہلا دائیں طرف والا ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد اگلا دائیں طرف والا قطعہ نمبر (جو اس سورۃ میں سے زیرِ مطالعہ ہے) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا نمبر البحث اللغۃ کے لیے ۱، البحث الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ لکھا گیا ہے مثلاً ۱:۳:۲ کا مطلب ہے سورۃ الفاتحہ کے تیسرے قطعہ میں بحث الاعراب]۔

**۲:۵** اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

### ۲:۵:۱ اللغۃ

[اِنَّ] یہ حرف مشبہ بالفعل ہے جو اپنے اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے۔ بلحاظِ معنی یہ حرفِ تاکید ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ "بے شک" یا "یقیناً" فارسی میں "ہر آئینہ" اور انگریزی میں VERILY, CERTAINLY سے کیا جاتا ہے۔

[اَلَّذِيْنَ] پر الفاتحہ: ۷ (۱:۶:۱) میں بات ہو چکی ہے یہاں اس کا ترجمہ "وہ لوگ جو کہ"، "جنہوں نے کہ"، یا صرف "جو کہ" سے بھی ہو سکتا ہے

© rasailojaraid.com

٢: ٥: ١ (١) [کَفَرُوْا] کا مادہ "ک ف ر" اور وزن "فَعَلُوْا" ہے۔
اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرّد کَفَر ..... یَکْفُرُ کُفْرًا (باب نصر سے) ہمیشہ متعدّی آتا ہے صلہ کے بغیر بھی اور باء (بِ) کے صلہ کے ساتھ بھی۔

● جب یہ فعل بغیر صلہ کے آئے تو اس کے بنیادی معنی "چھپا دینا" ہوتے ہیں۔ مثلاً کَفَرَ الشَّیْءَ = سَتَرَہٗ وَغَطَّاہُ = "..... کو چھپا دینا، ڈھانپ دینا"۔ اور ان ہی معنی کی بنا پر لفظ "کافر" عربی زبان میں اندھیری رات، سمندر اور کسان وغیرہ کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے

● پھر اسی سے اس فعل میں "ناشُکری کرنا" اور "بے قدری کرنا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان معنی کے لیے یہ (فعل) صلہ کے ساتھ بھی اور صلہ کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کَفَرَ نِعْمَۃَ اللّٰہِ یا کَفَرَ بِنِعْمَۃِ اللّٰہِ = اللہ کی نعمت کی ناشکری کرنا۔

© rasailojaraid

● پھر اس "ناشکری" سے ہی اس فعل میں "کسی چیز کو قبول کرنے یا ماننے سے انکار کرنا" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ تاہم ان معنوں (انکار کرنا) کے لیے یہ فعل بالعموم صلہ (بِ) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اور صلہ کے بعد مفعول مذکور ہوتا ہے یعنی کَفَر بِ ...... = ...... کا انکار کرنا، ...... کو نہ ماننا۔ مثلاً کَفَرَ بِاللّٰہِ = اس نے اللہ کا انکار کیا۔ اردو میں اس کے لیے "...... سے کفر کرنا" بھی استعمال ہوتا ہے۔
ان معنوں (انکار کرنا، نہ ماننا) کے لیے عموماً مفعول بنفسہٖ استعمال نہیں ہوتا یعنی "کَفَرَ اللّٰہَ" نہیں کہتے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم میں تین جگہ (البقرہ: ١٥٢، ہود: ٦٠، ٦٨) جہاں یہ فعل صلہ کے بغیر مفعول بنفسہٖ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً "کَفَرُوْا رَبَّھُمْ" __ تو یہاں "نعمۃ" کا لفظ محذوف مان لیا جاتا ہے۔ "یعنی کفروا نعمۃ ربھم" مراد ہے۔ دعائے قنوت میں "وَلَا نَكْفُرُكَ" بھی گویا دراصل "لا نکفر نِعْمَتَكَ" ہے ___ اور معنی ہیں "ناشکری یا بے قدری کرنا"۔

● بنیادی طور پر یہ فعل (کَفَر یکفُر) متعدی ہے۔ تاہم اکثر اس کا مفعول محذوف

© rasailojaraid

کر دیا جاتا ہے ۔(اور قرآن کریم میں یہ استعمال یعنی بغیر ذکر مفعول، بکثرت ہے ۔ جس کی ایک مثال یہی زیرِ مطالعہ آیت ہے)، اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ "کافر ہونا" منکر ہونا" سے بھی کر دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ یہ فعل لازم نہیں ہے ۔ دراصل ایسے تمام مواقع (استعمال) پر توحید، رسالت یا آخرت یا تینوں ہی مفعول محذوف ہوتے ہیں۔ یعنی "ایمانیات" کا انکار کرنا ۔ یا اسلام کے بنیادی عقائد کا انکار مراد ہوتا ہے جس کی اصل "حقیقت پر پردہ ڈالنا" ہی ہے ۔ اس طرح اصطلاحاً "کفر" (کافر ہونا) آمَن (ایمان لانا) کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مترجمین نے یہاں "کفروا" کا ترجمہ "کافر ہوئے، منکر ہوئے، کافر ہو چکے، کفر اختیار کیا" سے کیا ہے ۔ بعض نے "(قبولِ اسلام سے) انکار کیا" سے ترجمہ کیا ہے ۔ البتہ جن حضرات نے "انکار کیا" ترجمہ کیا ہے ۔ یہ اس لحاظ سے درست نہیں کہ اس میں اصل جملہ فعلیہ کو نظرانداز کر دیا گیا ہے ۔ مفہوم اور مطلب کے لحاظ سے اگرچہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے ۔

اس فعل ثلاثی مجرّد (کفر) کے تین مصدر استعمال ہوتے ہیں "کُفْرٌ" = انکار کرنا کُفْرانٌ = ناشکری، بے قدری کرنا اور "کُفُوْرٌ" (مندرجہ بالا) دونوں معنی کے لئے ۔ یہ تینوں مصادر قرآن کریم میں مستعمل ہوئے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس مادہ (کفر) سے بکثرت افعال اور مشتقات قرآن کریم میں آئے ہیں ۔ ان سب کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا ۔ ان شاء اللہ ۔

**۲ : ۵ : ۱ (۲)** [سَوَآءٌ] کا مادہ "س و ی" اور وزن اصلی "فَعَالٌ" ہے اور شکل اصلی "سَوَایٌ" مگر استعمالی وزن "فَعَاءٌ" رہ جاتا ہے ۔ کیونکہ الف ممدودہ کے بعد (خصوصاً آخر پر) آنے والی "ی" یا "و" کو عرب ھمزہ کی آواز میں بدل کر بولتے ہیں ۔ اس مادہ "(س و ی)" سے فعل ثلاثی مجرّد یا مزید فیہ کے استعمال کی بات ہم آگے چل کر وہاں کریں گے جہاں اس "مادہ" سے پہلی دفعہ کوئی فعل ہمارے سامنے آئے گا ۔ (اور یہ موقع البقرہ : ۲۹ میں آ جائے گا)۔

"سَوَاءٌ" دراصل فعل ثلاثی مجرّد کا مصدر ہے (جس پر مفصّل بات ابھی

© rasailojaraid

آگے آیت ۲۹ میں ہوگی) اس کے بنیادی معنی تو ہیں "برابری" یا "برابر ہونا" ۔ پھر یہ مصدر اسم الفاعل کے معنوں میں (برابر ہونے والا) بطور صفت یا ظرف استعمال ہوتا ہے۔ اور ان طرح اس میں "برابر"، "درمیان"، "ٹھیک درمیان"، یکساں"، "وسط" یا "مثل" یعنی "ٹھیک ایک جیسے" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً "ثَوْبٌ سَوَاءٌ" = جس کا طول اور عرض برابر ہوں۔ یا "سواءُ النھارِ = دن کا ٹھیک درمیان یعنی دوپہر ـــ سواءُ الجبل = پہاڑ کی چوٹی جہاں سے دونوں طرف ڈھلان شروع ہوتی ہے۔ اس قسم کی قرآنی تراکیب میں اس لفظ (سواء) کے استعمال کی ہی مثالیں "سواءُ السبیل"، "سواءُ الجحیم" اور "سواء الصراط" میں جن کی وضاحت اپنی اپنی جگہ ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● لفظ "سواء" مصدر ہونے کی بناء پر واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر مؤنث سب کے لیے یکساں رہتا ہے۔ مثلاً "ھُمَا سواءٌ" اور "ھُمْ یا ھُنَّ سواءٌ" کہتے ہیں۔ اگرچہ تثنیہ میں "سواءان" (مذکر مؤنث سب کے لیے) اور جمع میں "اَسْوَاءٌ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور "سواءٌ" کی غیر قیاسی جمع "سواسٍ" اور "سواسیۃ" بھی استعمال ہوتی ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں "سواء" کی جمع کہیں اور کسی طرح نہیں آئی۔ بلکہ جمع کے لیے بھی "سواءٌ" ہی استعمال ہوا ہے (مثلاً آل عمران: ۱۱۳ یا النساء: ۸۹ میں)

[عَلَیْھِمْ] کے معنی و ترکیب (علی + ھم) پر سورۃ الفاتحہ میں بات ہو چکی ہے۔ (۱:۱:۶ (۳))۔ "سَوَاءٌ علیھم" کا بالکل لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "برابر ہے اوپر ان کے" پھر اسی کو بامحاورہ بنانے کے لیے اس کا ترجمہ "برابر ہے ان کے حق میں"، "ان کو برابر ہے"، "انہیں برابر ہے"، "ان کے لیے برابر ہے"، "یکساں ہے ان پر"، "ان کے حق میں یکساں ہے"، "ان پر یکساں ہے" سے کیا گیا ہے اور بعض نے "علیھم" کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ "سواءٌ علیھم" کا ترجمہ صرف "برابر ہے" سے

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

ہی کردیا ہے۔ جسے محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے ہی درست قرار دیا جاسکتا ہے۔

**۲:۵ :۱(۳)** [**ءَ اَنْذَرْتَهُمْ**] یہ دراصل تین کلمات ہیں "ءَ + اَنْذَرْتَ + هُمْ" اِس میں "ءَ" یا "أَ" (جس کے رسم پر ابھی آگے بحث ہوگی)۔ تو همزۂ استفہامیہ ہے اور اس کے معنی "کیا؟" ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ دو چیزوں میں برابری بیان کرنے کے لیے لفظ "سَوَاءٌ" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اسے اصطلاح میں "همزة التسويه" (برابر کرنے والا همزہ) کہتے ہیں۔ یہ (همزة التسويه) عموماً "سَوَاءٌ (برابر ہے)"، "لَا اُبَالِيْ" (مجھے پروا نہیں)، "لَا اَدْرِيْ (میں نہیں جانتا)" اور "لَيْتَ شَعْرِيْ (کاش مجھے پتہ چلتا)" کے بعد آتا ہے۔ [قرآن کریم میں صرف "سَوَاءٌ" اور "أَدْرِيْ" کے ساتھ استعمال ہوا ہے] اور عموماً ان کے بعد ایک جملہ آتا ہے جو (بلحاظ معنی) مصدر کا کام دیتا ہے۔ اس وقت اس (أَ) کا اردو ترجمہ "کیا؟" کی بجائے "چاہے" یا "خواہ" سے کیا جاتا ہے۔ اور اردو میں تو اسی "چاہے" یا "خواہ" کی تکرار ہوتی ہے یا اس تکرار کی بجائے درمیان میں ایک "یا" استعمال کرتے ہیں۔ مگر عربی میں دوسرے "چاہے" یا "خواہ" کے لیے "أَمْ" لے آتے ہیں۔ جیسا کہ اسی زیرِ مطالعہ آیت میں آرہا ہے۔

[**أَنْذَرْتَ**] کا مادہ "ن ذ ر" اور وزن "أَفْعَلْتَ" ہے۔ اس مادّہ (نذر) سے فعل ثلاثی مجرد نَذَرَ يَنْذِرُ نَذْرًا (باب ضرب اور نصر سے) استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی "نذر ماننا" ہیں۔ [عربی زبان کا لفظ "نَذْر" اپنے اصل عربی معنوں کے ساتھ ہی اردو میں متعارف بلکہ متداول اور رائج ہے] اور اس فعل (ثلاثی مجرّد) سے قرآن کریم میں فعل ماضی کے صرف تین صیغے [البقرہ : ۲۷۰، آل عمران : ۳۵ اور مریم : ۲۶] اور مصدر "نَذْر" دو جگہ (البقرہ : ۲۷۰ اور الدهر : ۷) اور اس کی جمع "نُذُوْر" ایک جگہ (الحج : ۲۹) آئے ہیں۔ ان کی وضاحت اپنی اپنی جگہ کی جائے گی۔ انشاء اللہ

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

● "أَنْذَرْتَ" اس مادہ (نذر) سے بابِ اِفعال کے فعل ماضی معروف کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ اور بابِ اِفعال (أَنْذَرَ ..... يُنْذِرُ إِنْذَارًا) کے بنیادی معنی تو ہیں "..... کو خبر دینا' ..... کو بتا دینا' ..... کو نصیحت کرنا" مگر یہ صرف خوفناک چیز یا بُرے نتائج کے بارے میں وقت سے پہلے "خبر دینا" یا "سمجھا دینا" کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا موزوں ترجمہ (وقت سے پہلے) "خبردار کرنا"، "ہوشیار کرنا"، "وارننگ دینا"، "محتاط کرنا"، اور "خوف دلانا" ہی ہو سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین قرآن اس (فعل) کا ترجمہ "ڈرانا" کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض نے اس (فعل) کے بنیادی معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ "نصیحت کرنا" سے بھی کیا ہے۔ مگر اس میں اس فعل کی اصل SENSE (خصوصیت) یعنی "خوف والے معنی" سامنے نہیں آتے۔ اس طرح "أَأَنْذَرْتَ" کا لفظی ترجمہ ہوگا۔ "چاہے / خواہ تو نے ڈرایا" (خوف دلانے کے لیے) سمجھایا"۔

● إِنْذَار (جو بابِ افعال کا مصدر ہے) بنیادی طور پر متعدی "بمفعولین" یعنی دو مفعول کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک مفعول تو وہ ہوتا ہے جس کو ڈرایا یا سمجھایا جائے۔ دوسرا مفعول وہ چیز جس سے ڈرایا جائے۔ یہ دونوں مفعول عموماً بنفسہٖ (بغیر صلہ کے) آتے ہیں۔ مثلاً "أَنْذَرْتُهُ الشَّيْئَ = میں نے اس کو (اس) چیز سے ڈرایا"۔ یا مثلاً قرآن کریم میں ہے = "أَنْذَرْتُكُمْ نَارًا" = "میں نے تم کو آگ سے ڈرایا"۔ کبھی کبھار دوسرے مفعول سے پہلے "با" (ب) کا صلہ بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں۔ "أَنْذَرْتُهُ بِالْأَمْرِ = میں نے اسے معاملہ سے ڈرایا"۔ تاہم قرآن کریم میں کہیں بھی دوسرے مفعول کے ساتھ یہ صلہ (بِ) استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ (۱) عموماً دونوں مفعول (بنفسہٖ) مذکور ہوتے ہیں اور اس کی قرآن کریم میں نو (۹) مثالیں موجود ہیں (الانعام: ۱۳۰، ابراھیم: ۴۴، مریم: ۳۹، الزمر: ۷۱، المؤمن: ۱۸، فصّلت: ۱۳، القمر: ۱۳۶، النبأ: ۴۰ اور

© rasailojaraid.com

اللیل : ۱۴) ۔ (۲) البتہ زیادہ تر دوسرا مفعول محذوف ہوتا ہے (جو عموماً عذاب آخرت یا سزائے اعمال وغیرہ ہوتا ہے اور خود بخود سمجھا جاتا ہے) اس (دوسرا مفعول محذوف ہونے) کی بھی کم از کم پچیس (۲۵) مثالیں قرآن میں موجود ہیں ۔ (۳) اور بعض دفعہ پہلا مفعول محذوف کر دیا جاتا ہے (یعنی کفار یا مخاطب وغیرہ) مگر دوسرا مفعول (جس سے ڈرانا مقصود ہوتا ہے) مذکور ہوتا ہے قرآن کریم میں اس کی کم از کم تین مثالیں موجود ہیں (الکھف : ۲، غافر (المؤمن) : ۱۵، اور الشوریٰ : ۷) ـــــ (۴) اور بعض جگہ دونوں ہی مفعول محذوف کر دیئے گئے ہیں مگر وہ سیاقِ کلام سے سمجھے جا سکتے ہیں مثلاً " قُمْ فَأَنْذِرْ " (المدثر : ۲) " یعنی کھڑا ہو اور ڈرا " یہاں کس کو اور کس سے ڈرا؟ مذکور نہیں ہے ۔ اس کی ایک اور مثال (الاعراف : ۲) میں ہے ۔ یہ تمام امثلہ اور اس فعل (انذار) سے کچھ مزید افعال اور مشتقات قرآن کریم میں بکثرت وارد ہوئے ہیں ۔ ان سب کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا ـــــ یہاں (آیت زیر مطالعہ میں) " ءَأَنْذَرْتَهُم " میں ضمیر مفعول " ھم " کے بعد دوسرا مفعول (یعنی کس سے ڈرا؟) محذوف (غیر مذکور) ہے ۔

۲ : ۵ : ۱ (۴) [ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ ] جو دراصل أَمْ + لَمْ تُنْذِرْ + هُمْ ہے ۔ " أَمْ " تو یہاں ھمزۃ التسویہ کے " جواب " میں ہے (ھمزۃ التسویہ پر ابھی اوپر " ءَ " کے ضمن میں بات ہوئی ہے) اس کا اردو ترجمہ " چاہے " ، " خواہ " یا " یا " سے ہی ہوگا ۔ یہ (أَمْ) عموماً ھمزۃ التسویہ کے بعد آتا ہے ۔ اس لیے اسے " أَمْ متصلہ " (ساتھ والا) اور " أَمْ معادلہ " (برابری کے معنی دینے والا) بھی کہتے ہیں ـــــ بعض دفعہ یہ (أَمْ) ھمزۃ التسویہ کے بغیر مستقل جملہ کے شروع میں بھی آتا ہے ۔ اس وقت اسے " أَمْ منقطعہ " کہا جاتا ہے ۔ اس وقت اس کا اردو ترجمہ بطور استفہام " کیا " یا " آیا " کرتے ہیں ۔ اس کی مثالیں بھی آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی ۔

" لَمْ تُنْذِرْ " کا مادہ " ن ذ ر " ہے اور وزن " لَمْ تُفْعِلْ " ہے ۔

© rasailojaraid.co

یعنی یہ باب اِفعال سے فعل مضارع معروف منفی بِلَمْ کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ " اِنْذار" (یعنی اَنْذَرَ یُنْذِرُ) کے معنی پر ابھی اوپر " اَنْذَرْتَ " کے ضمن میں بات ہو چکی ہے۔ اس صیغے (لَمْ تُنْذِرْ) کا لفظی ترجمہ تو ہوگا " تونے ڈرایا ہی نہیں"۔ اور " ھُمْ " ضمیر مفعولِ اوّل کے لیے ہے۔ اس طرح " اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ " کا لفظی ترجمہ ہوا " چاہے / خواہ / یا تونے ڈرایا ہی نہیں ان کو"۔ یہاں دوسرا مفعول (یعنی کس چیز سے نہ ڈرایا) محذوف یعنی غیر مذکور ہے، جو سیاقِ کلام سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی جو آیت کے شروع میں آنے والے " کفروا " کا مفعول ہے۔ وہی یہاں مراد لیا جا سکتا ہے ــــ

● عربی زبان میں اس قسم کے " تسویہ " (چاہے ...... چاہے ......) کے بیان کے لیے عموماً دونوں جگہ فعل ماضی استعمال ہوتا ہے۔ لفظاً ہو معناً ــ جیسا کہ آپ یہاں دیکھ رہے ہیں کہ " اَنْذَرْتَ " بلحاظ لفظ بھی ماضی ہے جب کہ " لَمْ تُنْذِرْ " بلحاظ معنی ماضی ہے۔ یوں اس حصۂ آیت " ءَ اَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ " کا لفظی ترجمہ تو ہوگا: " خواہ ڈرایا تونے ان کو خواہ (یا) ڈرایا ہی نہیں تونے ان کو " ــــ اردو محاورے میں ایسے موقع پر عموماً فعل مضارع استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اردو مترجمین نے اس (حصّہ آیت) کا ترجمہ " تو ان کو ڈراوے یا نہ ڈراوے۔" پھر " ڈراوے " ذرا پرانی اردو ہے اس لیے بعد کے مترجمین نے " ڈرائے یا نہ ڈرائے " استعمال کیا ہے۔ بعض نے ضمیر فاعل واحد مخاطب کا ترجمہ " تو " کی بجائے " تم "، اور بعض نے مزید احتراماً " آپ " کیا ہے اور یوں " تم ڈراؤ یا نہ ڈراؤ " اور " آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں " نصیحت کریں یا نہ کریں " سے ترجمہ کیا گیا ہے ــــ " اِنذار " کے ان معنوں پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے۔

۲:۵:۱ (۵) [ لَایُؤْمِنُوْنَ ] کا مادہ " ا م ن " اور وزن " لَایُفْعِلُوْنَ " ہے۔ یعنی یہ اس مادہ (امن) سے باب افعال کا فعل مضارع معروف منفی صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ سیاقِ کلام (جس طرح بات چل رہی ہے) کی بنا پر یہاں

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

فعل مضارع کا ترجمہ فعل مستقبل کی صورت میں کرنا زیادہ موزوں ہے ۔ یعنی" وہ ایمان نہیں لائیں گے "۔ بعض مترجمین نے " ایمان " کا " کفر " (بمعنی انکار کرنا ۔ نہ ماننا) کی ضد ہونے کی بنا پر اس کا ترجمہ " نہیں مانیں گے " کیا ہے اور بعض نے اردو محاورے کے مطابق نفی کا زور ظاہر کرنے کے لیے اس کا ترجمہ " وہ ایمان لانے کے نہیں " کیا ہے ۔ البتہ جن حضرات نے اس کا ترجمہ " وہ تو ایمان لانے والے نہیں " سے کیا ہے وہ محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے درست ہونے کے باوجود اصل عبارت (متن) سے دور جانے والی بات ہے ۔ کیونکہ یہ " لایؤمنون " (جملہ فعلیہ) سے زیادہ " وما ھم بمؤمنین " (جملہ اسمیہ) کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے ۔

## ۲:۱:۵ الاعراب

" ان الذین کفروا سواء علیھم ءَ أنذرتھم ام لَم تُنْذِرھُمْ لایومنون "۔

[ إِنَّ ] حرف مشبہ بالفعل ہے ۔ یہاں (آیتِ زیرِ مطالعہ میں) اس کا اسم بھی اور خبر بھی جملے ہیں ۔ اور ان کو محلاً ہی منصوب اور مرفوع قرار دیا جا سکتا ہے ۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ [ الذین ] اسم موصول ہے ۔ اور " إِنَّ " کی وجہ سے منصوب ہے اگرچہ مبنی ہونے کی وجہ سے کوئی علامتِ نصب ظاہر نہیں ہے ۔ [ کفروا ] یہ جملہ فعلیہ یعنی فعل مع فاعل ہے جس میں ضمیر فاعل " ھم " مستتر ہے ۔ یہ جملہ فعلیہ " الذین " (موصول) کا صلہ ہے اور صلہ موصول مل کر (الذین کفروا) " إِنَّ " کا اسم ہے یعنی محلاً منصوب ہے ۔ [ سَوَاءٌ عَلَیھِم ] کے اعراب (یا ترکیب) کی تین صورتیں ممکن ہیں :

(۱) اسے (سواء علیھم " کو) " إِنَّ " کی خبر بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور مابعد کی عبارت " ءَ أنذرتھم ام لم تنذرھم " کو مصدری معنی کے ساتھ اسی خبر (سواءٌ علیھم) کا ایک حصّہ سمجھ لیا جائے یعنی " برابر

ہے ان پر تیرا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا" اور خود یہ عبارت [ ءَ اَنْـذَرْتَهُم ] ایک جملہ ہے جس میں ھمزۂ تسویہ کا ہے اور " انـذرتَ " فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعل " أنتَ " مستتر ہے اور " ھم " ضمیر منصوب متصل مفعول بہ ہے۔ اسی طرح [ اَم لم تُنـذرھم ] بھی ایک جملہ ہے جس میں " اَم " متصلہ جواب ھمزۂ التسویہ ہے۔ " لَم تُنْذِرْ " فعل مضارع معروف منفی " بِلَم " ہے اور اسی لیے مجزوم ہے۔ علامت جزم " رْ " کا سکون ہے۔ اور آخری " ھم " ضمیر منصوب متصل اس فعل (لَم تُنذِر) کا مفعول بہٖ ہے۔

(۲) اور یہ بھی جائز ہے کہ اس پوری عبارت (ءَ اَنْذَرْتَھُم اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ) کو مبتداء مؤخر اور " سواءٌ علیھم " کو اس کی خبر مقدم قرار دیا جائے۔ پھر اس سارے جُملے (سواءٌ ...... تنـذرھم) مبتدأ و خبر کو " اِنَّ الـذین کفروا " کی خبر سمجھا جائے اس صورت میں ترجمہ کی صورت یوں ہو گی " بے شک الـذین کفروا (کافروں) کو " ءَ اَنـذرتھم ام لم تنـذرھم " (تیرا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا۔ مصدری معنی) " سواءٌ علیھم " (برابر ہے ان پر) ـــــ ان دونوں تراکیب (۱) و (۲) کے لحاظ سے آخری حصّہ آیت [ لا یؤمنون ] کو جو مضارع معروف منفی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے اور جس میں ضمیر فاعلین " ھم " مستتر ہے ـــ اس (لا یؤمنون) کو " اِنَّ " کی دوسری خبر سمجھا جائے گا۔ اور

(۳) تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ " لا یؤمنون " کو تو " اِنَّ الـذین کفروا " کی خبر قرار دیا جائے اور درمیانی عبارت " سواءٌ علیھم ءَ انذرتھم اَم لم تنـذرھم " کو جملہ معترضہ سمجھ لیا جائے۔ تینوں تراکیب کے لحاظ سے اردو ترجمہ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا سوائے اس کے کہ لفظوں کی تاخیر یا تقدیم کر دی جائے۔ مذکورہ بالا تین تراکیب کے لحاظ سے ترجمہ یوں ہو گا۔ (اس میں اختصار کے لیے " الـذین کفروا " کا ترجمہ " کافروں " کر لیا گیا ہے اور " ءَ انـذرتھم ام لم تنـذرھم " کے مصدری معنی لیے گئے ہیں)۔

© rasailojaraid.

(۱) بے شک " کافروں " پر برابر ہے ۔ " تیرا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا "۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔

(۲) بے شک " کافروں " کو " تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا " برابر ہے ۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔

(۳) بے شک کافر لوگ ــــ چاہے تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ۔ برابر ہے ــــ ایمان نہیں لائیں گے ۔

اکثر مترجمین نے تیسری صورت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ۔

## ۲:۵:۳ الرسم

" الـذین " کے رسم پر بات ہو چکی ہے الفاتحہ : ( ۱ : ۶ : ۲ ) [کفروا] کی واو الجمع کے بعد ایک زائد الف " ا " کا لکھنا رسم عثمانی اور رسم املائی دونوں کی رو سے لازمی ہے ۔ [ تاہم رسم عثمانی کے مطابق قرآن کریم میں چار افعال کے ساتھ واو الجمع کے باوجود یہ زائد الف نہیں لکھا جاتا ۔ ان مقامات کا ذکر اپنی جگہ آئے گا ] ۔ اور یہ (زائد الف لکھنے کا) قاعدہ ہر واو الجمع کے بارے میں ہے جس کی تین چار صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) ماضی معروف یا مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب مثلاً " قَتَلوا ۔ قُتِلوا " (۲) مضارع (معروف یا مجہول) مجزوم یا منصوب کا صیغہ جمع مذکر غائب یا حاضر مثلاً " لم یُقتَلُوا ۔ لن یُقتَلُوا ۔ وغیرہ " (۳) فعل امر یا نہی (معروف یا مجہول) کے یہی دو صیغے (جمع مذکر غائب و حاضر) مثلاً " لا تکفروا " وغیرہ میں ۔

● واو الجمع کے بعد اس " الف زائدہ " (جو پڑھا نہیں جاتا) کے لکھنے کی دو تین وجوہ بیان کی گئی ہیں مثلاً

(۱) یہ واو الجمع (جو فعل کے جمع کے بعض صیغوں کے آخر پر آتی ہے) اور واو العطف (بمعنی " اور " والی) میں فرق کرنے اور التباس سے بچنے کے لیے لکھا جاتا ہے ۔ مثلاً اگر صرف " کفرو " لکھا ہو تو بعض جگہ اسے " کَفَرَوَ ...... " پڑھنے

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

کی غلطی ہو سکتی ہے ۔

(۲) ناقص واوی کے صیغہ مضارع معروف صیغہ واحد مذکر غائب (پہلا صیغہ) مثلاً یدعو ، یعفو ، یمحو وغیرہ سے فرق کرنے کے لیے ۔ [اس قسم کے صیغوں کی " واو " کو " الواو المتطرفة " یعنی ایک کنارے پر آنے والی " واو " کہتے ہیں ] تاہم یہ قاعدہ بھی رسمِ املائی کی حد تک ہی لازمی ہے ۔ رسمِ قرآنی اس قاعدہ کا پابند نہیں ہے قرآن کریم میں بعض خاص مقامات پر اس قسم کے صیغوں کے ساتھ بھی " زائد الف " لکھا جاتا ہے یعنی " یدعوا ، یمحوا " وغیرہ اور بعض ایسے کلمات کے آخر پر بھی " الف زائدہ " لکھا جاتا ہے جہاں عام رسمِ املائی میں زائد الف لکھنا درست نہیں ہے ۔ مثلاً " ادلو " کو بھی " ادلوا " لکھنا ۔

(۳) بعض صورتوں میں " جمع مذکر سالم مرفوع مضاف " اور " صیغۂ فعل " میں فرق کرنے کے لیے ـــــ مثلاً " قاتلوالمشرکین " (مشرکوں کے قاتل) میں لفظ مضاف (قاتلو) " قاتل کی جمع مذکر سالم ہے " ۔ جو دراصل " قاتلون " تھا مگر مضاف ہونے کے باعث اس کا نونِ اعرابی گر گیا اور " قاتلو " ہو کر مضاف ہوا ۔ مگر " قاتلوا المشرکین " (اس کے دو الف " ا ا " نوٹ کیجئے) میں " قاتلوا " بابِ مفاعلہ (مقاتلہ یا قتال) کا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر غائب " قاتَلوا " یا فعل امر کا صیغہ جمع حاضر " قاتِلوا " ہو سکتا ہے ۔ پہلی صورت میں ترجمہ " وہ مشرکوں سے لڑے " اور دوسری صورت میں " تم مشرکوں سے لڑو " ۔ ہو گا ۔ اس قسم کے لفظوں میں اس زائد الف کے ذریعے ہی یہ تمیز ممکن ہے ۔

ان توجیہات سے آپ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ـــــ اور عام عربی املاء میں بھی ـــــ حروف زوائد (جو لکھے جاتے ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے) ۔ اور اس قسم کے اور بھی کئی قسم کے " زوائد " آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گے ۔

ـــــ یہ " زوائد " دراصل عربی دان اور صرف و نحو سے واقف آدمی کو غیر مشکول

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

عبارت میں لفظ کی درست "شکل" کی طرف رہنمائی کرتے ہیں [1]

[سوائہٗ] اصل مصاحف عثمانیہ میں یہ لفظ "سوا" (بغیر آخری ھمزہ کے) لکھا گیا تھا۔ بلکہ ان مصاحف میں جہاں بھی ھمزہ متطرفہ (کسی کلمہ کے آخر پر آنے والا ھمزہ) اگر کسی حرفِ ساکن کے بعد آتا تھا، اسے لکھنے میں حذف کر دیا گیا تھا۔ ھمزہ ابتدائیہ۔ وصل کا ہو یا قطع کا ــــ ہمیشہ بصورتِ الف اور ھمزہ متوسطہ (کلمہ کے درمیان میں آنے والا ھمزہ) حسب موقع "الف" یا "و" یا "ی" کی صورت میں لکھا گیا تھا ــــ مثلاً "بأس" کو "باس"، "بُؤس" کو "بوس"، (قرآن کریم میں لفظ "بؤس" کہیں نہیں آیا اس کی بجائے مثال "مُؤمن" کو "مومن" لکھنے کی سمجھ لیجئے) اور "بِئْس" کو "بیس" لکھا گیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض اہلِ زبان (مثلاً اہلِ حجاز) اس قسم کے ھمزہ کا تلفظ ہی نہیں کرتے تھے۔ اور جو قبائل اس قسم کے ہمزہ کا تلفظ کرتے تھے وہ اپنی زباندانی کی بناء پر سمجھ جاتے تھے کہ یہاں ھمزہ "موجود" ہے۔ اس قسم کے ھمزہ کے تلفظ میں اختلاف کی بھی یہی وجہ ہے۔

● بعد میں (قریباً پہلی صدی ہجری کے آخر پر) جب علاماتِ ضبط ــــ ایجاد ہوئیں تو ھمزہ کے لیے بھی علامت مقرر کی گئی۔ شروع میں یہ علامت زرد، سرخ یا سبز رنگ کا گول نقطہ ہوتا تھا ــــ اور بعض افریقی ملکوں میں اب تک اس کا رواج چلا آتا ہے ــــ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں الخلیل الفراھیدی نے حرف "عین" کے سرے (ء) کو ھمزہ (القطع) کی علامت مقرر کیا [2] اس وقت سے آج تک ھمزہ کی یہ صورت اکثر اسلامی ممالک میں رائج ہے۔ قرآن کریم کی کتابت میں بھی اور عام عربی املاء میں بھی۔ بعض ممالک میں "ء" کی بجائے E ، S ، ع ، ٥ وغیرہ بھی مستعمل ہیں۔

---

[1] "شکل" کے معنی ہیں کسی لفظ کے ہر ہر حرف پر حرکت دینا۔ اور ایسے الفاظ کو "مشکول" کہتے ہیں مثلاً "مُبَشِّرٌ" یا "مَدِیْنَة" وغیرہ۔

[2] جیسے بعض اہل علم "عین بتراء" (دُم کٹی عین) بھی کہتے ہیں اور بعض متأخرین علماء نے اس کے لیے "مَحْرُوْرَہ" (گول میم) کی اصطلاح استعمال کی ہے (مثلاً صاحب نثر المرجان)

© rasailojaraid

[ ءَ اَنْذَرْ تهم ] یہ لفظ بھی مصاحفِ عثمانیہ میں " انـذرتهم " یعنی ابتدائی همزۂ کے حذف کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ کیونکہ یہ همزۂ استفہام ہے اور عثمانی مصاحف میں یہ قاعدہ ملحوظ رکھا گیا تھا کہ جہاں بھی همزۂ استفہام کے فوراً بعد همزۂ قطع یا همزۃ الوصل سے شروع ہونے والا (اسم یا فعل) آتا تو اس سے پہلے همزۂ استفہام کتابت میں محذوف کر دیا جاتا۔

- بعد میں جب علامتِ همزہ ایجاد ہوئی تو وہ اس محذوف همزہ کی جگہ لکھی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ سے پہلے دونوں همزہ (همزہ استفہام اور همزۂ قطع) بصورت الف نہیں لکھے جاتے یعنی اسے "أأنذرتهم" کی بجائے "ءَ أَنذرتهم" کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم رہے کہ رسمِ عثمانی میں سے ابتدائی همزہ (استفہام) نہیں لکھا گیا تھا۔ ورنہ عام عربی املاء میں اسے "أأنذرتهم" لکھنا بالکل درست ہے [ دوسرے لفظوں میں رسمِ عثمانی پر ایک الف "ا" کا اضافہ بھی جائز نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ ایک نبرہ (دندانہ) کی کمی بیشی بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ آگے اس کی مثالیں بھی ہمارے سامنے آئیں گی ]۔

[ أم لم تنـذرهم ] اور [ لا یؤمنون ] کی املاء عام رسمِ معتاد کے مطابق ہی ہے۔

## ۲:۵:۴ الضبط

(ان الـذین کفروا سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم لا یؤمنـون)

آیت زیر مطالعہ میں اختلاف ضبط کی حسب ذیل صورتیں موجود ہیں :-

(۱) همزۃ الوصل کے علامت ڈالنا یا نہ ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس علامت کی شکل (صـ ، ہ) کا فرق۔ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ یہ "علامتِ الوصل" صرف عرب اور افریقی ملکوں کے مصاحف میں ڈالی جاتی ہے مشرقی ممالک میں اس کا رواج

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

نہیں ہے۔ بہرحال اس اختلاف کا اثر کلمہ " الـذین " کے ضبط میں ظاہر ہوتا ہے۔
(۲) ھمزۃ القطع میں علامت قطع کا ڈالنا یا ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس کی صورت کا اختلاف۔ کسی کلمہ کے ابتداء میں آنے والے ھمزۃ القطع (جو ہمیشہ بصورت " الف " ہی لکھا جاتا ہے) پر مشرقی ممالک میں علامت قطع نہیں ڈالی جاتی۔ درمیان میں یا آخر پر آنے والے ھمزۃ القطع کے لیے علامتِ قطع تمام ملکوں میں ڈالی جاتی ہے البتہ اس کی شکل وصورت میں فرق ہے (ء، E ، ء یا O (زرد گول نقطہ)۔ اس اختلاف کا اثر کلمات " إِنَّ " ، سواء ، " ءَ انذَرْتَهُم اور " أم " اور " لا یؤمنونَ " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔
(۳) واو ساکنہ ماقبل مضموم پر علامت سکون ڈالنے کا رواج صرف برصغیر میں ہے۔ اس کا نمونہ " [illegible] " اور " لا یومنون " کے ضبط میں سامنے آئے گا۔
(۴) یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامت سکون ڈالنے کا رواج بھی صرف برِصغیر میں ہے اور اس ماقبل پر علامت کسرہ ( ـِ ) کی بجائے علامتِ اشباع۔ کھڑی زیر ( ـٖ ) ڈالنے کا رواج صرف ترکی اور ایران میں ہے۔ اس کا نمونہ آپ " الـذین " کے ضبط میں دیکھیں گے۔
(۵) الف (ساکنہ) کے ماقبل پر فتحہ ( ـَ ) کی بجائے علامتِ اشباع۔ کھڑی زبر۔ ( ـٰ ) ڈالنے کا رواج صرف ایران میں ہے اس کا نمونہ یہاں " سواءٌ " اور " لا " کے ضبط میں دیکھیں گے۔
(۶) واو الجمع کے بعد آنے والے الف زائدہ پر علامتِ زیادۃ (تنبیخ) ڈالنے کا رواج صرف افریقی اور عرب ملکوں کے مصاحف میں ہے۔ یہ علامت عموماً چھوٹا سا لمبوترہ " دائرہ " ہوتا ہے ( ٥ )۔ اس فرق کو آپ " کفروا " کے ضبط میں دیکھیں گے
(۷) نونِ مخفاۃ (ساکنہ) کو علامتِ سکون سے معری رکھنے کا رواج بھی صرف عرب اور افریقی ملکوں میں ہے۔ برِصغیر، چین، ایران اور ترکی میں اس کا رواج نہیں البتہ بعض علاقوں (مثلاً چین) میں اور بعض مصاحف (ایڈیشنوں) کے اندر نون ساکن

© rasailojaraid.c

کے اس اخفاء کو بعض دیگر طریقوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً چین میں ایسے نون پر علامت سکون کے ساتھ تین ہلکے نقطے ڈال دیتے ہیں۔ مصحف حلبی (مطبوعہ قاہرہ مصر) اور تجویدی قرآن (مطبوعہ پاکستان) میں نون ساکنہ مخفاۃ کے لیے ایک خاص علامت سکون (ہ ، ٮ) وضع کی گئی ہے۔ ضبط کے اس فرق کو آپ کلمات "انذرتھم" اور "تنذرھم" میں دیکھیں گے۔

(۸) تنوین اظہار کے لیے الگ متراکب حرکات کا استعمال بھی صرف عرب اور افریقی ممالک میں ہوتا ہے یا پاکستانی تجویدی قرآن میں اسے اپنایا گیا ہے — تمام مشرقی ممالک میں تنوین — اخفاء ہو یا اظہار — کے لیے یکساں علامت تنوین استعمال ہوتی ہے۔ اس اختلاف کا اثر کلمہ "سواء" کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۹) نونِ متطرفہ (آخر پر آنے والے نون) پر علامتِ اعجام (نقطہ) نہ ڈالنے کا رواج صرف افریقی مصاحف میں نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کا اثر "الذین" اور "لا یؤمنون" کے ضبط میں دیکھیں گے۔

(۱۰) "سائر" (سا) کی ترقیق یا تفخیم کا لحاظ رکھتے ہوئے (از روئے قواعد تجوید) راء مفخمہ کے لیے "سا" اور رائے مرققہ کے لیے "ر" کا استعمال صرف تجویدی قرآن (پاکستانی) میں کیا گیا ہے۔ اس کا نمونہ آپ کو "کفروا"، "أَنذرتهم" اور لم تنذرھم" میں ملے گا۔

اس طرح مجموعی طور پر آیت زیرِ مطالعہ کے کلمات میں اختلافِ ضبط کی حسبِ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں — ملاحظہ کیجیے کہ اصل رسمِ عثمانی تمام کلمات کا یکساں ہی رہتا ہے

إِنَّ ، إِنَّ ، إِنَّ ، إِنَّ

الَّذِينَ ، الَّذِينَ ، الَّذِينَ ، الَّذِينَ

كَفَرُوا ، كَفَرُوا ، كَفَرُوا

© rasailojaraid.com

سَوَآءٌ ، سَوَآءٌ ، سَوَآءٌ ، سَوَاۤءٌ عَلَیْھِمْ

ءَ اَنْذَرْتَھُمْ ، ءَ اَنْذَرْتَھُمْ ، ءَاَنْذَرْتَھُمْ

ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ ، اَمْ ، اَمْ

لَمْ تُنْذِرْھُمْ ، لَمْ تُنْذِرْھُمْ ، لَمْ تُنْذِرْھُمْ

لَا یُؤْمِنُوْنَ ، لَا یُؤْمِنُوْنَ ، لَا یُؤْمِنُوْنَ ،

لَا یُؤْمِنُوْنَ

---

## بقیہ : ہدایت القرآن

ہوتا اور اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کی خلاف ورزی نہ کی جاتی ۔ ہر حساس آدمی کو ایسے موقع پر بڑی بے چینی ہوتی ہے اور صحابہ کرامؓ تو شریعت کے معاملہ میں بڑے حساس تھے ۔ اللہ نے اس موقع پر جو انداز اختیار کیا ہے وہ بھی سمجھانے کا ہے کہ تمہیں ایسا نہ کرنا چاہیے ۔ خیر اب جو کچھ ہو گیا وہ ہو گیا ۔

۲ آیت میں ایک بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے، جس کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے ۔ وہ یہ کہ عبادت اور روزہ جیسی عبادت بھی اپنا فائدہ کھو دیتی ہے، اگر ایک دوسرے کے حق کی حفاظت نہ کی گئی، زیادتی و حق تلفی سے بچا نہ گیا، حرام آمدنی و کمائی سے اپنے کو محفوظ نہ کیا گیا ۔ درمیان میں یہ آیت اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے ۔ آیت میں ان مذہبی سرمایہ داروں کے لیے بھی بڑی تنبیہ ہے جو روزہ تو رکھ لیتے ہیں اور حج پر حج کرتے رہتے ہیں یا کرلتے رہتے ہیں لیکن ان سے غریبوں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں، ان پر زیادتی اور انکی حق تلفی کرتے ہیں، حرام آمدنی اور کمائی سے نہیں بچتے ہیں ۔ ایسے لوگ روزہ اور حج دونوں کے فائدہ سے محروم رہتے ہیں ۔ یہ آیت روزہ اور حج کے احکام کے درمیان میں ہے ۔ اس کے بعد حج کا ذکر ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ دار اور حاجی دونوں کو تنبیہ مقصود ہے ۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری مذہبی زندگی "معاملات کی درستگی" سے خالی ہوگئی ہے، حالانکہ عبادات و معاملات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں ۔ اگر معاملات کو الگ کر دیا جاتے تو نہ صرف یہ کہ عبادات بے معنی ہو جاتی ہیں بلکہ پورا اسلام ایک "کھلونا" بن کر رہ جاتا ہے ۔

© rasailojaraid.c